Date of Publication: 02-04-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 APRIL 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 APRIL 2013
Issue: 14, Vol.: 72

۸تا۱۴؍اپریل۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر: ۱۴، جلد نمبر: ۷۲

وشوناتھ طاؤس
C-38، سیکٹر 39
نوئیڈا (یوپی) 201303

فلمی دنیا کی ادبی باتیں

جب کوہ قاف پر اردو کا آشیانہ تھا

ہندوستانی فلموں کے ممتاز مزاحیہ اداکار مرزا مشرف ایک زمانے میں لاہور میں نیوز ایجنٹ تھے اور کانگریس پارٹی کے دفتر میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ ۱۹۲۷ء میں جب برٹش سرکار کی جانب سے سائمن کمیشن ہندوستان آیا اور لاہور پہنچا تو کانگریسیوں اور احراریوں نے اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور ایک لمبا جلوس نکالا جس کی قیادت لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے۔ اس جلوس میں مرزا مشرف بھی شامل تھے اور اپنے ہاتھوں میں 'سائمن کمیشن واپس جاؤ' کا بینر تھامے ہوئے تھے۔ جلوس کو منتشر کرنے کے لیے انگریز افسروں کے اشارے پر پولیس نے مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا، بہت سے لوگ زخمی ہوئے، کچھ لاٹھیاں لالہ لاجپت رائے کے جسم پر بھی پڑیں، جو گہری تھیں، وہ شدید طور پر زخمی ہوئے اور یہی زخم ان کی موت کا باعث بنے۔ مرزا مشرف بڑے فخر کے ساتھ یہ آنکھوں دیکھا واقعہ فلم جرنلسٹوں کو سنایا کرتے تھے۔ اداکاری کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے وہ شعر سازی اور اصلاح سخن کا دھندا بھی کرتے تھے۔ معمولی قسم کے شاعر تھے لیکن اُلٹے سیدھے مزاحیہ اشعار سنا کر مشاعروں میں داد وصول کرلیا کرتے تھے۔ اُن کے اشعار اُن کے ہونٹوں سے دہانے سے شروع ہوکر اُن کی گول گول آنکھوں کی جنبش پر ختم ہوتے۔ ہاتھ پاؤں اس طرح ہلاتے اور جسم کو اس طرح ٹل دیتے مانو قلا بازی کھا رہے ہیں۔ نوجوان ان اداؤں اور طرز ادائیگی پر مر مٹتے اور داد و واہ کے ڈونگرے برساتے۔ اخباری حلقوں سے وابستگی کے باعث وہ اپنی اچھی رپورٹنگ کروالیتے۔ اگلے روز جب اخبارات میں مشاعرے کی روداد شائع ہوتی تو اسے دکھا کر اپنے شاگردوں پر رُعب جماتے کہ دیکھو میں کتنا بڑا شاعر ہوں۔ لاہور میں آئے دن کوئی نہ کوئی مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا اور اکثر ان بلائے ہوئے بھی مرزا جی اپنا کلام سنانے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس طرح اُن کی خود ساختہ پبلسٹی کا کاروبار چلتا رہتا تھا۔

مرزا مشرف کے ہدایت کار میاں اے آر کاردار (پورا نام عبدالرشید کاردار) سے دوستانہ مراسم تھے جو پہلے مشہور کاتب اسمٰعیل کے ساتھ مل کر مختلف اداروں کے لیے پوسٹر پینٹ کیا کرتے تھے۔ بعد میں لاہور میں فلم انڈسٹری شروع ہونے پر انھوں نے فلم سازی شروع کردی۔ یونائیٹڈ پلیئرز (United Players) کے پرچم تلے انھوں نے پہلے کچھ خاموش فلمیں اور بعد میں کئی متکلم پکچریں تیار کیں۔ مرزا مشرف نے بھی فلم لائن میں پاؤں رکھے اور پنچولی کی فلم 'خاندان' میں انگلینڈ ریٹرن نوجوان کا کامیڈی رول ادا کرکے اپنے نام کے جھنڈے گاڑ دیے۔

اے آر کاردار لاہور سے شفٹ ہوکر بمبئی پہنچے تو انھوں نے فلم 'باغبان' بنانے کا اعلان کیا جس کی ہیروئن بملا کماری تھی۔ اس فلم کے گانے لکھنے کے لیے کاردار نے مرزا مشرف کو بمبئی بلا بھیجا۔ مرزا جی بحیثیت شاعر تو فلمی دنیا میں کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکے مگر بطور کامیڈین انھوں نے زبردست شہرت حاصل کی اور ایک سو سے زائد فلموں میں مزاحیہ رول ادا کیے۔ بمبئی میں 'ہولی' اُن کی پہلی کامیاب فلم تھی۔ اس کے بعد مسافر، دوست، گرہستی، نسبت، دل کی بستی، فریادی، آئینہ، مہندی، مغرور، اوشا کرن، سنسکار، پولیس، برسات کی رات وغیرہ فلموں میں کام کیا۔ نگار سلطانہ کو ہیروئن لے کر فلم 'دولتی نیّا' (ڈائرکٹ کی مگر وہ فلاپ ہوگئی۔ اُن کی فلم 'ماں باپ' کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے۔ یہ ایک سوشل فلم تھی اور اسے بڑے اچھے ڈھنگ سے فلمایا گیا تھا لیکن پہلے دن پہلے شو پر لوگوں نے کوئی خاص اشتیاق ظاہر نہیں کیا۔ مرزا جی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے سنیما ہاؤس کے باہر کھڑے ہوکر بھونپو ہاتھ میں پکڑ کر زور زور سے کہنا شروع کردیا:

ماں باپ دس دس آنے
ماں باپ دس دس آنے

اُن دنوں تھرڈ کلاس کا ٹکٹ دس آنے کا ہوا کرتا تھا۔ لوگ یہ مزاحیہ جملہ سن کر اکٹھے ہونے لگے اور جوق در جوق ٹکٹ خریدنے لگے۔ ہاؤس فل ہوگیا۔ فلم بہت اچھی تھی چل نکلی اور اس نے سلور جوبلی منائی۔

مشہور شاعر رام پرکاش قمر جلال آبادی نے فلم لائن میں داخل ہونے سے پہلے کئی سال تک لاہور سے نکلنے والے دو اردو روزناموں 'پرتاپ' اور 'ملاپ' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ انھوں نے اپنا اخبار 'استاد' وسکلی بھی نکالا مگر وہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ اُن کی ملاقات سیٹھ دلسکھ ایم پنچولی سے ہوئی تو انھوں نے اپنی اگلی فلم 'زمیندار' کے لیے گانے لکھنے کی دعوت دی۔ اس فلم کے یہ دو گانے بہت مقبول ہوئے:

☆ دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا
☆ میری زندگی بھی کوئی زندگی ہے

فلم 'زمیندار' کو متوقع کامیابی حاصل نہ ہوئی حالاں کہ اس کی ہیروئن بمبئی کی مشہور ایکٹرس شانتا آپٹے تھی جسے خاص طور سے لاہور بلایا گیا تھا۔ اس کے بعد قمر نے پنچولی پکچرز کی 'پنچھی' 'پنگی' کے گیت لکھے جس کی ہیروئن منور سلطانہ تھی اور یہ اس کی پہلی فلم تھی۔ 'پنگی' کے یہ دو گیت بڑے پاپولر ہوئے:

☆ ارمان تڑپتے ہیں، روتی ہیں تمنائیں
☆ بے آسوں کی زندگی کا سہارا کون ہے

فلم 'سہارا' کے نغمے بھی قمر کے قلم سے نکلے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ لاہور کی فلم انڈسٹری میں اُن کی کوئی قدر نہیں ہورہی تو انھوں نے اس شہر کو خیرباد کہا اور پربھات پکچرز پونا میں شمولیت اختیار کرلی۔ پہلے انھوں نے فلم 'چاند' اور اس کے بعد 'رام شاستری' کے گیت لکھے۔ یہ دونوں فلمیں خوب چلیں۔ دو سال تک پربھات پکچرز میں کام کرنے کے بعد وہ بمبئی چلے گئے اور وہاں بطور فری لانسر گیت اور مکالمے

لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انھیں اچھا معاوضہ ملنے لگا جو سینکڑوں سے لے کر ہزاروں روپے تک پہنچ گیا جب کہ لاہور میں اُن کا معاوضہ ایک سو روپے سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ انھوں نے بے شار فلموں کے گانے لکھے جن میں شہید، گونا، ریتوکا، بڑی بہن اور شبنم مقبول عام ہوگئیں۔ قمر نے شیام، کرن دیوان اور نرگس کو لے کر ایک فلم 'چھوٹی بھائی' پروڈیوس کی جو گھریلو نوعیت کی تھی اور باکس آفس پر کامیاب ثابت ہوئی۔

اردو کے مشہور مصنف جناب وید راہی کا تعلق اُس ممتاز خانوادے سے ہے جسے ریاست کشمیر میں اردو جرنلزم کا جنم داتا کہا جاتا ہے۔ وید راہی کے والد محترم لالہ ملک راج صراف ریاست کے اولین اردو جرنلسٹ تھے جو ملک گیر پیمانے پر اُبھر کر سامنے آئے۔ مہاشے کرشن، جناب خوشحال چند، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالمجید سالک اور سردار دیوان سنگھ مفتون تک سے اُن کے روابط تھے اور یہ سب انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ریاست کی مطلق العنان حکومت کے دور میں اور فرنگی سرکار کی سخت گیر پالیسی کے باوجود انھوں نے آزاد صحافت کا پرچم بلند رکھا اور عوام کے جذبات کی بدرجۂ احسن ترجمانی کی۔ اپنی سادگی، شرافت، خداداد قابلیت اور وضع داری کے باعث انھوں نے اردو اخبار نویسی پر گہری چھاپ چھوڑی۔ انھوں نے کئی بڑے اخبارات کی نمائندگی کی اور اپنے میگزین جاری کیے۔ انھوں نے بچوں کے لیے ایک صاف ستھرا اور آسان ماہنامہ 'رتن' جاری کیا جو بڑا مقبول ہوا۔ راقم لڑکپن میں اس رسالے کا باقاعدہ خریدار تھا۔ ۱۹۵۰ء میں لالہ ملک راج صراف اور وید راہی سے میری ملاقات بھی ہوئی تھی جس کے بارے میں راہی صاحب کو اب کچھ یاد نہیں ہوگا کیوں کہ اس کے بعد میرے اُن سے براہِ راست مراسم قائم نہ رہے۔

وید راہی جب نوجوان تھے تو ریاست جموں و کشمیر کے محکمۂ اطلاعات کے تحت چھپنے والے رسالے 'یوجنا' کے اڈیٹر تھے۔ وہ اُس زمانے میں افسانے لکھا کرتے تھے جو مختلف جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ انھیں کہانیاں لکھنے کا خبط تھا اور 'یوجنا' جیسے اطلاعاتی پرچے میں اُن کی صلاحیتیں دبی ہوئی تھیں۔ انھوں نے بمبئی جانے اور وہاں فلموں کے لیے کہانیاں لکھنے کا عندیہ کیا اور سرکاری ملازمت چھوڑ دی۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ کامیابی حاصل کیے بغیر بمبئی سے گھر نہیں لوٹیں گے۔ انھوں نے کافی محنت اور ریاضت کے بعد بمبئی کی فلم انڈسٹری میں جگہ بنائی۔ وہ رامانند ساگر کے معاون بن گئے جو نامور فلم ساز، ہدایت کار اور مصنف تھے۔ ساگر صاحب نے کئی بڑی اور کامیاب فلمیں بنائیں جن میں اکثر کی شوٹنگ غیر ممالک میں بھی ہوئی۔ وید راہی ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے۔ وہ غیر ممالک سے شوٹنگ کی روداد ہندوستان سے چھپنے والے اردو اخبارات کو بھیجتے رہے۔ مجھے اُن کی وہ رپورٹ اب تک یاد ہے جو انھوں نے بیروت میں فلم 'آنکھیں' کی شوٹنگ کے دوران مرتب کی تھی اور جو روزنامہ 'ملاپ' میں شائع ہوئی تھی۔ اس طرح وہ ساگر آرٹ پکچرز کے پبلسٹی آفیسر بھی تھے۔

۱۹۷۳ء میں وید راہی نے اپنی کہانی پر مبنی ایک آرٹ فلم 'دراڑ' تیار کی جو نئی کاسٹ کے ساتھ چھوٹے بجٹ کی

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

دوسری اور آخری قسط

اوجؔ یعقوبی کی شخصیت اور شاعری

ڈاکٹر سید بشیر احمد (فلیٹ نمبر B-1، سکھ منی اپارٹمنٹ، لکڑی کا پل، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۴)

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں بعض الفاظ کو علامتوں کے طور پر استعمال کر کے ان کے معنوں میں اضافہ کیا ہے مثلاً شاہین، خودی، مرد مومن، فقر، آتش نمرود وغیرہ۔ اوجؔ یعقوبی نے بھی اپنے کلام میں بعض الفاظ جیسے وقار، ردا، آنسو، طاعت کو علامتوں کے طور پر استعمال کر کے ان کے معنوں میں اضافہ کیا ہے۔ ان کا کلام جو حضور اقدسؐ اور اہل بیت اطہار سے والہانہ عقیدت اور محبت سے پُر ہے، شاید رسالت مآبؐ کی پسندیدگی کا باعث ہو، اس لیے آسمانِ شاعری پر اوجؔ کا ستارہ اوجِ پر نظر آتا ہے۔

اوجؔ یعقوبی کو اہل اللہ سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ حضرت سیف الدین شرفی سیف جو اپنے وقت کے بلند پایہ بزرگ تھے، جو شریعت، طریقت اور معرفت پر عبور رکھنے کی وجہ سے حیدرآباد میں منفرد مقام کے حامل تھے گو اوجؔ ان کے دامن گرفتہ تو نہ تھے لیکن حضرت سے عقیدت کاملہ رکھتے تھے اور ان کے وصال پر انھوں نے مسدس کی ہیئت میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا، جس کا ایک بند درج ذیل ہے:

اہل نظر کی کم نظری کو خبر نہ تھی
گنج نہاں کی دست رسی کو خبر نہ تھی
تم سے کدہ تھے تشنہ لبی کو خبر نہ تھی
تم کیا تھے، کون تھے، یہ کسی کو خبر نہ تھی
ناآشنا قدم تھے انا کے حدود سے
نفرت تھی تم کو دہر میں نام و نمود سے

اگرچہ اوجؔ یعقوبی نے آزاد نظم اور معریٰ نظم کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ وہ قدیم دبستانِ شاعری کے پاسدار رہے لیکن ان کی شاعری صرف حسن و عشق، فراق و ہجر اور گل و بلبل کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ جدید رجحانات اور عصری مسائل کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ ان کو قواعدِ زبان اور فنِ شعر پر کامل دسترس تھی۔ ان کی زندگی میں شاعری نہ صرف مشغلہ بلکہ ذریعۂ روزگار بھی تھی۔ سخی اور تنگ آبادی کی طرح انھوں نے دکنی محاوروں کو بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا ہے اس طرح انھوں نے محاوروں کو زیادہ معتبر بنایا۔ شاعر حساس ہوتا ہے اور آفاقیت کی صفت سے بھی متصف رہتا ہے، اوجؔ بھی اپنے ماحول اور سماج کے مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے اور انھوں نے اپنی شاعری میں ان مسائل کا شدت سے ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے وہ سماجی شاعر کی حیثیت سے شہرت پا گئے۔ وہ نئے لہجے کے شاعر اور منفرد اسلوب کے حامل تھے۔ الفاظ کی بندش میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ سلاست، شستگی اور شگفتگی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ ذیل میں ان کی غزلوں کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

وارفتہ سے کدہ ہم جو موجود تھے
کیوں کر اٹھے کہ ساقی بلاتے گئے

تمھاری انجمن آخر کے مجھ کو بھول جاؤگے
چھڑایا رہ گزر بن کر بھی جتا جاتے ہیں ہم

موجودہ سیاسی انقلابات کی طرف ان کا درج ذیل شعر ملاحظہ ہو:

رخ ہواؤں کا بدلتے نہیں تکتی وہ
ڈوب جاتے ہیں سفینے بھی ساحل کے قریب

سیاسی افق پر ہونے والی تبدیلیوں کا وہ کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں:

کس کو امید تھی صبح کی گود میں
اور گھر سے اندھیرے ہو جائیں گے

شمع اور پروانے کے تعلق سے مختلف شعرا نے مختلف مضامین باندھے ہیں لیکن اوجؔ یعقوبی کا منفرد اسلوب ملاحظہ ہو:

شمع اپنے سے نہیں جلتی جلانے کے بغیر
وہ جو خود جل کے جلاتا ہے وہ پروانہ ہے

ذیل کے شعر میں اوجؔ یعقوبی نے اہل اقتدار طبقے کی ناانصافیوں کو کس خوبی سے اجاگر کیا ہے، ملاحظہ ہو:

کچھ پی پی کے بہکتے ہیں کچھ وعظ کرتے ہیں
منصب سے بتادے کوئی یہ ہے میری ساقی

اوجؔ قنوطیت پسند نہیں بلکہ وہ رجائیت پسند تھے۔ وہ نوجوانوں کو پامردی کا درس دیتے ہیں:

زندگی کے سینے میں کاش آپ ڈٹ جاتے
حادثوں میں دم کتنا ہے سے ہٹ جاتے

ذیل کے شعر میں انھوں نے حسی کیفیت کا کس عمدگی سے اظہار کیا ہے، ملاحظہ ہو:

پوچھا جو حال تم ہم مسکرا دیے
اظہار غم میں بھی حسین انتشار ہے

ان کی شاعری میں چند نصائح ملتے ہیں:

انساں میں بلندی کردار چاہیے
پابندِ وضع ہو تو غریبی وقار ہے

اوجؔ یعقوبی ظاہر سے باطن کا اندازہ کرنے کو مناسب خیال کرتے ہیں:

سپردگی نہ سمجھ ان کے مسکرانے کو
گلوں کا کام ہے تبسم مسکراتے ہیں

ذیل کے شعر میں اوجؔ نوجوانانِ قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سلام ان پر جو چھاتے ہوئے ہیں صحرا پر
گریز ان سے جو گلوں میں ڈوب جاتے ہیں

اوجؔ یعقوبی اظہار غم سے گریز کرتے ہیں:

قیمتِ غم پر بازار نہ گرنے پائے
گھر گرے پڑے کی دیوار نہ گرنے پائے

رند پی کر بہک جاتے ہیں لیکن ساغر تند سے تند شراب کے اثر کو قبول نہیں کرتے۔ اس مضمون کو انھوں نے اس طرح باندھا ہے:

رہتا ہے ہوش میں خود سب کو بہلانے والا
کتنی ہی تند ہو سے ساغر نہیں بہکتے

مخدوم محی الدین بڑے باظرف رند تھے۔ اوجؔ ان کی بادہ خواری اور ان کے ظرف کے تعلق سے کہتے ہیں:

مخدومؔ کو جو دیکھا ہم کو یہ یاد آیا
اے اوجؔ ظرف والے پی کر نہیں بہکتے

موجودہ سیاسی استبداد کا وہ اس طرح احاطہ کرتے ہیں:

حالت یہ ہے ہیں اوجؔ ہر گل بلکہ تری تھے

کس کے گلے پڑے گی سرِ عام سے پوچھے
کہنے کو تو ملک آزاد ہو گیا لیکن آزادی کے ثمرے سے ملک کے تمام طبقات بہرہ ور نہیں ہو سکے۔ اس مضمون کو انھوں نے اس طرح ادا کیا:

فصلِ بہار آئی تو پھول آپ کے ہوئے
فرمائیے حضور ذرا ہم کو کیا ملا

محبوب اگر مل جائے تو کوئی کوئی غم سے بھی سامنا ہو سکتا ہے، اوجؔ نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے:

مانگ کر آپ کو کونین کے غم مانگ لے
ہم سے اب اور نہیں کوئی دعا ہونے کی

ہر صبح کے بعد شام کا ہونا قانونِ فطرت ہے، اوجؔ کہتے ہیں:

راحت میں بھی اک صورتِ آلام چھپی ہے
ہر صبح کے پردے میں کوئی شام چھپی ہے

ذیل کے شعر میں اوجؔ یعقوبی کی رجائیت پسندی کا اظہار ہوتا ہے:

سحر، سحر ہے وہ مخمور و دلکشی ہی سہی
سیاہی ایک کرن سے شکست کھاتی ہے

کانگریسی حکومت کے آخری دور میں ٹی۔ انجیا (چیف منسٹر حکومت آندھرا پردیش) نے ان کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈیوڑھی خورشید جاہ میں منعقدہ مشاعرے میں ان کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازا۔

یہ شاعر خوش گو جس نے لاتعداد بے زبانوں کو زبان عطا کی۔ کتنے ہی متشاعر ان کی شاعرانہ فیاضی کی وجہ سے صاحبِ دیوان شاعر بن گئے جس کی وجہ سے دورِ سخنی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ۳ر اگست ۱۹۸۳ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور احاطہ مسجد الٰہی چادر گھاٹ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

❀❀❀

ساگر یونیورسٹی میں اردو تحقیق

ڈاکٹر وسیم انور (نئی بستی، بڑا کربلا، ساگر-470002 [ایم.پی])

ساگر یونیورسٹی (ڈاکٹر ہری سنگھ گور یونیورسٹی، ساگر) مدھیہ پردیش کی یونیورسٹیوں میں اہم مقام رکھتی ہے۔ یہاں تحقیق کے تعلق سے کئی کام سرانجام دیے گئے ہیں۔ ساگر یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں اردو ادب سے متعلق ہیں تحقیقی مقالات موجود ہیں، جن کے پیش کرنے والوں کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی جا چکی ہے۔ پہلا مقالہ ۱۹۷۹ء میں پیش کیا گیا تھا اور آخری ۲۰۰۹ء میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی کے نئے قاعدے یو جی سی کی طرف سے ۲۰۰۹ء میں نافذ کیے گئے، جس کے تحت ہنوز کوئی تحقیقی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پایا ہے۔

تحقیق حق کی تلاش، جستجو کا نام ہے اور حقائق کی تجدید کرنا انتہائی مشکل عمل ہے۔ اس عمل میں کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک صاحب تحقیق میں زبان دانی، حقائق کی پرکھ، ادب باریک بینی اور مواد کی حصول یابی کے بعد حالات و واقعات کی روشنی میں غیر جانبدارانہ طور پر صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت اور قابلیت موجود نہ ہو۔ اسے تحقیقی مقالے کی وسعت کا اندازہ نہیں ہو سکے گا اور وہ مقالے کو مضمون نگاری کی حدود سے باہر نہ لا سکے گا۔

یہ سارے مقالے پی ایچ ڈی کی اس خام پالیسی کے تحت پیش کیے گئے تھے جو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنی رہی۔ اگر ان مقالات کو پیش کرنے والوں اور نگراں حضرات کے نام کے بغیر غیر جانبدار محقق کی کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکتا ہے۔ یہ حال صرف ساگر یونیورسٹی کے مقالات اور صرف اردو کا نہیں بلکہ تمام زبانوں اور سارے ملک کی یونیورسٹیوں کا ہے۔ جن لوگوں نے کبھی ایک مضمون بھی نہیں لکھا انہیں تحقیقی مقالہ لکھنے کو دے دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف کتابوں سے نقل کر کے اور نگراں حضرات کی معاونت پر مقالہ تیار ہو جاتا ہے۔

ساگر یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی ۱۸ر جولائی ۱۹۴۶ء کو شعبۂ اردو فارسی کا قیام عمل میں آیا اور جناب پی ایل پاٹھک کو اعزازی طور پر عارضی لیکچرر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں جناب ڈی پی امر عارضی لیکچرر مقرر ہوئے۔ مستقل لیکچرر اور صدر شعبۂ اردو فارسی کے طور پر جناب محمد صدیق صدیقی نے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۸۶ء تک اپنی خدمات انجام دیں اور پھر اعزازی طور پر ۱۹۹۰ء تک کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ خاتون صدیقی نے ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک لیکچرر کے عہدے پر کام کیا۔

ڈاکٹر فداء المصطفیٰ فدوی کا ۱۹۹۰ء میں لیکچرر اور صدر شعبۂ اردو فارسی کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں ریڈر ہوئے اور کامیابی سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ شعبۂ اردو فارسی میں ایک اسامی ۱۹۹۵ء سے خالی ہے جس پر عارضی تقرری سے کام چلایا جا رہا ہے۔

ساگر یونیورسٹی کی تاسیس و بنیاد ہی سے شعبۂ اردو فارسی قائم ہے۔ ۱۹۸۳ء سے شعبۂ اردو میں ایم اے اردو کا آغاز ہوا۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ ایم اے شروع ہونے کے تقریباً چار سال پہلے ہی ۱۹۷۹ء میں پی ایچ ڈی کے لیے پہلا تحقیقی مقالہ پیش کیا گیا۔ یہ ایک قابل بحث موضوع ہے۔ اس مرحلے میں معلومات و تفصیلات کا فقدان ہے۔

زیر تذکرہ میں تحقیقی مقالات دو تحقیقی مراکز کے توسط سے پیش کیے گئے ہیں:

(۱) شعبۂ اردو فارسی، ڈاکٹر ہری سنگھ گور یونیورسٹی، ساگر، ایم پی

(۲) شعبۂ اردو فارسی، سیوا سدن کالج برہان پور، ایم پی

مذکورہ تحقیقی مقالات کی قلم بندی میں نگراں کے فرائض انجام دینے والوں میں صرف تین نام ہی سامنے آتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) محمد صدیق صدیقی

(۲) ڈاکٹر محمد شفیع

(۳) ڈاکٹر فداء المصطفیٰ فدوی

ان تینوں نگراں صاحبان کا ایک مختصر تعارفی خاکہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) محمد صدیق صدیقی:

یونیورسٹی کے شعبۂ اردو فارسی کی تاریخ میں محمد صدیق صدیقی کا نام ڈاکٹر ایم ایس صدیقی درج ہے۔ ان کے زیر نگرانی چار تحقیقی مقالات پیش کیے گئے ان میں ڈاکٹر ایم ایس صدیقی کے بجائے نگراں کا نام محمد صدیق صدیقی تحریر ہے۔ اس کی وضاحت نہیں ملتی البتہ روایتاً لوگوں سے سنا گیا ہے کہ موصوف اپنا نام پروفیسر ایم ایس صدیقی بتاتے تھے۔

محمد صدیق صدیقی صاحب کی نگرانی میں کل چار تحقیقی مقالات لکھے گئے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) 'آغا حشر کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ' محمد شفیع، ۱۹۷۹ء

(۲) 'اردو میں خاکہ نگاری کا تنقیدی جائزہ' سید فاروق حسنین، ۱۹۸۶ء

(۳) 'مولانا راشد الخیری: حیات اور کارنامے' ہاجرہ خاتون صدیقی، ۱۹۸۸ء

(۴) 'جگت موہن لال رواں اور ان کی شاعری' محمد اشفاق عارف، ۱۹۹۰ء

(۲) ڈاکٹر محمد شفیع

شعبۂ اردو فارسی ساگر یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں سیوا سدن کالج برہان پور میں صدر شعبۂ اردو فارسی مقرر ہوئے۔ دیگر حضرات اور آپ کی کوششوں سے سیوا سدن کالج برہان پور میں ایم اے اردو شروع ہوا اور پھر ریسرچ سنٹر کا بھی قیام عمل میں آیا۔

تحقیقی مقالہ 'ہندی رنگ چیتنا کے وکاس میں آغا حشر کاشمیری کا یوگ دان' پر، ہندی زبان میں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ شفیع صاحب کی دس کتابیں، کئی تحقیقی مضامین، غزلیں، نظمیں اور ڈرامے شائع ہوئے ہیں۔ کتابوں کے نام اس طرح ہیں:

(۱) امیر حسن اور اس کا تنقیدی مطالعہ، جولائی ۱۹۸۳ء

(۲) مثنوی گلزار نسیم مع تنقیدی جائزہ ۱۹۸۴ء

(۳) چکبست اور ان کی منتخب نظمیں، ۱۹۸۵ء

(۴) نظیر اکبر آبادی اور ان کی منتخب نظمیں ۱۹۸۵ء، بار دوم: ۲۰۰۵ء

(۵) آغا حشر کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۸۸ء

(۶) نئی روشنی (تعلیم بالغان) ۱۹۸۵ء

(۷) مضامین شفیع، ۱۹۹۸ء

(۸) سلور کنگ اور اس کا تنقیدی مطالعہ

(۹) انشا نگاری، طنز و مزاح اور تنقید، ۲۰۰۱ء

(۱۰) غبار دل (مجموعۂ کلام) ۲۰۰۹ء

شفیع صاحب کی زیر نگرانی کل تیرہ تحقیقی مقالے تحریر کیے گئے جن میں سے آٹھ ساگر یونیورسٹی اور پانچ اندور یونیورسٹی میں پیش ہو کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔

ساگر یونیورسٹی میں موجود آٹھ مقالوں کی فہرست اس طرح ہے:

(۱) اردو غزل کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (حالی تا ۱۹۶۰ء)، فیروز حسین حامی، ۱۹۸۶ء

(۲) دکن کے ممتاز صوفی شعرا کے کلام کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، سید شرف الدین پیرزادہ، ۱۹۸۸ء

(۳) مولانا ظفر علی خاں، بحیثیت شاعر، سید قاضی شکیل الدین، ۱۹۸۹ء

(۴) دکن کے اہم مثنوی نگار اور ان کے کلام کا تنقیدی مطالعہ، محمد حسان انصاری، ۱۹۹۰ء

(۵) اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں اور ان کی نعت گوئی، سید جمیل الدین جمیل، ۱۹۹۱ء

(۶) شمالی بندیل کھنڈ کے اہم شعرا کے کلام کا تنقیدی مطالعہ، شہناز احمد، ۱۹۹۱ء

(۷) ساگر کمشنری کے اہم اردو شعرا اور ان کے کلام کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، محمد ادریس نظامی، ۱۹۹۶ء

(۸) آیوروید اور یونانی فن طب کی تصانیف و تراجم اور اردو ادب میں طب یونانی، کبیر عالم قادری، ۱۹۹۸ء

(۳) ڈاکٹر فداء المصطفیٰ فدوی

ڈاکٹر فداء المصطفیٰ فدوی کی ادبی و تدریسی خدمات شعبۂ اردو فارسی کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر فداء المصطفیٰ فدوی اور ڈاکٹر ہاجرہ خاتون صدیقی کی تقرری کے بعد شعبۂ اردو فارسی میں نئی جان آ گئی اور طالب علموں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ فدوی صاحب نے حقیقی طور پر پڑھانے لکھانے کا کام شروع کیا اور طالب علموں کی صحیح تربیت کی۔

فدوی صاحب ایم اے اردو، ایم اے فارسی، بی ایڈ اور پی ایچ ڈی اردو ہیں۔ اردو اور فارسی کے قدیم و جدید ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ کم و بیش 35 برس سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ پڑھتے زیادہ ہیں لکھتے کم ہیں، لیکن جو کچھ بھی لکھتے ہیں وہ بہت غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔

فدوی صاحب کی تین کتابیں اور بیسیوں تحقیقی مضامین، متعدد غزلیں اور نظمیں وغیرہ وقتاً فوقتاً ہند و پاک کے معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) احتشام حسین: حیات و شخصیت اور کارنامے، ۱۹۸۵ء

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

راجدھانی کے اسکولوں میں 34 فیصد اساتذہ کی اسامیاں خالی

اردو زبان کی 73 فیصد اساتذہ کی اسامیاں خالی

نئی دہلی (۱۹ مارچ)۔ ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کے قومی جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس کو دہلی کے ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن سے حق اطلاعات قانون کے ذریعے ملی جانکاری کے مطابق دہلی میں تقریباً ۳۴ فیصد اساتذہ کی اسامیاں خالی ہیں۔ آر ٹی آئی سے ملے اہم دستاویز یہ بھی بتاتے ہیں کہ دہلی میں کل 29444 اساتذہ ہیں جن میں سے صرف 19675 عہدوں پر ہی اساتذہ کام کر رہے ہیں، یعنی 9769 اساتذہ کی اسامیاں فی الحال خالی ہیں۔ وہیں دوسری سرکاری زبان مانی جانے والی اردو زبان کے لیے 262 اساتذہ کے عہدے ہیں جن میں 70 عہدوں پر ہی اساتذہ تعینات ہیں۔ 192 یعنی 73 فیصد اساتذہ کے عہدے فی الحال خالی ہیں۔

آر ٹی آئی سے ملی معلومات کے مطابق انگریزی زبان کے لیے کل 5096 اساتذہ کی اسامیاں ہیں جن میں 3438 عہدوں پر ہی اساتذہ تعینات کیے گئے ہیں یعنی 1658 (32 فیصد) اساتذہ کے عہدے فی الحال خالی ہے۔ وہیں ہندی زبان کے لیے کل 4606 اساتذہ کے عہدے ہیں جن میں 3376 عہدوں پر ہی اساتذہ کام کر رہے ہیں یعنی 1230 (26 فیصد) اساتذہ کے عہدے فی الحال خالی ہیں۔ یہی نہیں، سنسکرت زبان کے لیے بھی کل 4179 اساتذہ کے عہدے ہیں، جن میں 2463 عہدوں پر ہی اساتذہ بحال ہیں یعنی 1716 (41 فیصد) اساتذہ کے عہدے فی الحال خالی ہیں۔

یہی حال دہلی میں پنجابی زبان کا بھی ہے۔ پنجابی زبان کے لیے کل 254 اساتذہ کے عہدے ہیں جن میں 150 عہدوں پر اساتذہ کام کر رہے ہیں، یعنی 104 (40 فیصد) اساتذہ کے عہدے فی الحال خالی ہیں۔ پنجابی بھی دہلی کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سرکاری اسکولوں میں بچوں کو ڈرائنگ سکھانے کے لیے 1054 اور میوزک سکھانے کے لیے 334 اساتذہ کے عہدے رکھے گئے ہیں۔

ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن کے زون 19، ضلع جنوبی ویسٹ اے، وسنت وہار سے آر ٹی آئی سے ملی معلومات کے مطابق اس زون میں کل 725 اساتذہ ہی تعینات ہیں اور 262 اساتذہ کے عہدے خالی ہیں۔ مزید برآں اردو زبان کے لیے ایک بھی استاد کا عہدہ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس علاقے کے کسی بھی اسکول میں اردو زبان کو بطور سبجیکٹ نہیں پڑھایا جاتا ہے جب کہ اس زون میں کل 21 سرکاری اسکول ہیں اور تمام اسکولوں میں سنسکرت، میوزک اور یوگا کے ٹیچرس تعینات ہیں۔

وہیں شمالی دہلی میونسپل کارپوریشن سے آر ٹی آئی سے ملی معلومات کے مطابق 2070 کی اسامیاں پرنسپل، 21780 عہدے پرائمری ٹیچرس اور 1801 عہدے نرسری ٹیچرس کے لیے رکھے گئے ہیں، جن میں 717 پرنسپل، 7106 ریگولر ٹیچرس اور 1477 کنٹریکٹ ٹیچرس فی الحال تعینات ہیں۔ ساتھ ہی شمالی دہلی میونسپل کارپوریشن آر ٹی آئی سے ملی معلومات یہ بھی بتاتی ہے کہ شمالی دہلی میونسپل کارپوریشن میں اردو اور پنجابی اساتذہ کے لیے کوئی بھی عہدہ نہیں رکھا گیا ہے، یعنی اردو یہاں بھی ندارد ہے۔

سرکاری اسکولوں کی حالت چاہے جیسی بھی ہو لیکن حکومت ابھی اسکولوں پر بھی خاصی رقم خرچ کر رہی ہے۔ ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن سے ملی معلومات کے مطابق گزشتہ دس سالوں میں 110226613 کروڑ روپے خرچ کر چکی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اسکول میں استاد ہی نہیں رہیں گے تو بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری کو دہلی اردو اکادمی کا کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ

پروفیسر محمد ذاکر، ماجد رحمن، ڈاکٹر عبدالرشید اور اسرار جامعی بھی انعام یافتگان میں شامل

نئی دہلی (۱۴ مارچ)۔ معروف نقاد، ادیب اور دانشور پروفیسر اسلوب احمد انصاری کو ۲۰۱۲ء کے لیے اردو اکادمی دہلی کے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو صحافی سید حامد علی زیدی المعروف ماجد رحمن کو اردو صحافت کے لیے ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ اعلان آج اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن اور وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کے ذریعے اکادمی کی ایوارڈ سب کمیٹی و ایگزیکٹو کمیٹی کی تجاویز سے اتفاق کرتے ہوئے ایوارڈز کی توثیق کے بعد کیا گیا۔

اردو اکادمی نے اس سال اردو شعر و ادب، صحافت، طنز و مزاح اور بچوں کے ادب سے متعلق 8 ایوارڈز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اکادمی کا سب سے بڑا 'بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' ماہر اقبال و غالب اور مایہ ناز نقاد و دانشور پروفیسر اسلوب احمد انصاری کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اسلوب احمد انصاری دو درجن تحقیقی و تنقیدی کتابوں کے مصنف ہیں۔ کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے تحت انہیں ایک لاکھ روپے، شال، سند اور مومنٹو پیش کیا جائے گا۔ اس حیثیت کا دوسرا بڑا ایوارڈ 'پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ' دہلی کے معروف محقق، نقاد اور سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر محمد ذاکر کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ بھی ایک لاکھ روپے پر مشتمل ہے۔

علاوہ ازیں، اردو کے معروف و بزرگ صحافی و ادیب ماجد رحمن کو اس مرتبہ اردو صحافت کا ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اردو صحافت میں ماجد رحمن کا نام انتہائی احترام سے لیا جاتا ہے اور صحافت کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے علاوہ ممتاز محقق اور تنقید نگار ڈاکٹر عبدالرشید کو ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید، ممتاز افسانہ نگار رتن سنگھ کو تخلیقی نثر کا ایوارڈ، دہلی کے بزرگ اور استاد شاعر شاد فدائی کو ایوارڈ برائے شاعری، طنز و مزاح کے مقبول شاعر اسرار جامعی کو ایوارڈ برائے طنز و مزاح، بچوں کے معروف و مقبول کہانی کار اور کارٹونسٹ واجد علی شاہ کو ایوارڈ برائے ادب اطفال پیش کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

نو تعمیر شدہ اردو میڈیم اسکولوں کی عمارتیں

درس و تدریس کی مُنتظر

ہگلی، مغربی بنگال (۱۰ مارچ)۔ ۲۰۰۱ء کے اسمبلی الیکشن سے قبل اردو والوں سے درس گاہوں کے نام پر جس طرح ووٹ بینک کی سیاست کی گئی وہ اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ مارکسی حکومت کے آخری دور میں جس طرح کرہلی والوں کے دیرینہ خواب کہ یہاں ایک اردو میڈیم گرلس ہائی اسکول قائم کیا جائے تاکہ بچیاں علم کی دولت سے بہرہ ور ہو سکیں، اس طرح اسکول کے لیے زمین کرہلی جوٹ مل سے دس کٹھہ اراضی شائق کٹک اردو میموریل ہائی اسکول کے نام سے میونسپل کے ماتحت رجسٹری کرائی گئی اور تعمیری کام زور و شور سے جاری ہوا۔ پہلی منزل بن کر تیار ہو گئی لیکن آج تک اس میں پڑھائی شروع نہیں ہوئی جب کہ نئی حکومت اور مقامی ایم ایل اے اور وزیر اسپورٹس و ٹرانسپورٹ مدن مترا کی کوششوں سے فنڈ فراہم کر کے دوسری منزل ابھی زیر تعمیر ہے۔ سیشن تو ختم ہو گیا مگر درس و تدریس کب شروع ہوگا یہ اب تک ایک خواب ہے۔ دوسری جانب یہی روایت جانی نگر میں دہرائی گئی جہاں دس کٹھہ زمین پر ایک منزلہ اسکول کی عمارت اسی دور میں تعمیر ہوئی اور رنگ و روغن کر کے بچوں کے انتظار میں، تعلیم شروع ہوگی اس سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔ تیسری جانب چاپدانی میں بھی ترنمول کانگریس کے اہم لیڈر کلیان بنرجی نے بھی اردو ہائی اسکول کی بنیاد رکھی اور تعمیری کام شروع ہوا۔ کہا تو یہ گیا تھا کہ دسمبر سال سے یہاں پڑھائی شروع کروائی جائے گی مگر دوسرا سیشن بھی نکل گیا اور اسکول ننھے ننھے بچوں اور تشنگان علم کے قدر دانوں کو اپنی جانب کھینچنے میں ناکامیاب ہے بلکہ اب تو آئندہ سال پارلیمانی انتخاب بھی ہونے والا ہے اور کلیان جی کو بھی اپنا وعدہ یاد نہیں رہا جہاں ایک بھی اردو میڈیم ہائی اسکول میسر نہیں۔ بہر حال مارکسی حکومت کے زوال کے بعد نئی حکومت نے جب اقتدار سنبھالا تو اردو والوں کی آنکھوں میں ایک نئی چمک اور امید کی کرن دکھائی دی جو اب دھندلی ہونے لگی ہے۔ اس سلسلے میں اپنوں کی بے حسی اور کوئی آواز بلند ہونا اور دوسری جانب انتظامیہ میں بیٹھے افسران جو خدا واسطے اہل اردو کو علم سے عاری رکھنا چاہتے ہیں کیوں کہ حکومتیں بدل تو جاتی ہیں لیکن ان کی ازلی فطرت نہیں بدلتی۔ وزیر اعلیٰ نے جس طرف ریاست میں دس فیصد اردو آبادی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ ۲۰۰۹ء میں پارلیمنٹ سے پاس شدہ حق تعلیم قانون جس میں ہر ہندوستانی کو بنیادی حق دیا گیا ہے مگر اس کا اطلاق نہیں ہوا۔ اس ضمن میں جب ریاست گیر سطح پر اردو والوں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اردو اسکولوں کی تعداد آبادی کے لحاظ سے آٹے میں نمک کے برابر دکھائی دیتی ہے۔ اس سلسلے میں اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین جمال شاہ القادری بھی اگر اس جانب توجہ دیں تو ممکن ہے کہ ان علاقوں کے اردو والے آئندہ سیشن سے فیضیاب ہو سکیں۔

(اخبار مشرق، دہلی)

آئندہ سال میٹرک امتحان میں فارسی کو شامل کرنے کا فیصلہ

پٹنہ (۲۳ مارچ)۔ وزیر تعلیم پی کے شاہی نے اعلان کیا ہے کہ ۲۰۱۴ء میں میٹرک کے امتحان میں فارسی اور عربی کو آپشنل سبجیکٹ (اختیاری مضمون) کے طور پر شامل کیا جائے گا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ۲۰۱۳ء کے میٹرک امتحان میں فارسی اور عربی کو ساتویں سبجیکٹ کے طور پر نصاب میں شامل کرنے کی ہدایت دی گئی تھی لیکن کچھ افسروں کی لاپروائی کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ اپوزیشن لیڈر عبدالباری صدیقی نے اسمبلی میں کہا کہ سال ۲۰۱۰ء تک بہار سکنڈری ایجوکیشن بورڈ سات مضامین میں میٹرک کا امتحان لیتا تھا۔ اس کے تحت ایڈوانس میتھ میٹکس، معاشیات، سنسکرت، میتھلی اور فارسی وغیرہ ہوتے تھے، اسے ۲۰۱۱ء میں ختم کر دیا گیا۔ طلبہ اور ٹیچروں کی ناراضگی کی وجہ سے حکومت نے ۲۰۱۳ء کے بورڈ کے امتحان میں دوبارہ پرانا سسٹم نافذ کر دیا۔ ۲۸ نومبر ۲۰۱۲ء کو نوٹیفکیشن جاری کر کے اعلان کیا گیا کہ ۲۰۱۳ء سے میٹرک امتحان سات مضامین میں ہوگا، لیکن ضلع تعلیم افسروں اور ہیڈ ماسٹروں کو سرکلر نہیں بھیجا گیا جس کی وجہ سے نئے سات مضامین کی فہرست جاری کی گئی اور نہ ہی پڑھائی شروع کی گئی۔ بہار سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کی جب اس طرف توجہ مبذول کرائی گئی تو بورڈ نے ضلع تعلیم افسروں کو خط لکھا لیکن اس وقت

یوپی سکریٹریٹ میں اردو کو ختم کرنے کی منصوبہ بند سازش

نئی دہلی۔ ریاستی سرکار جہاں ایک طرف اردو کے فروغ اور ترقی کے لیے کوشاں ہے وہیں اترپردیش سرکار کے اردو مخالف افسران اردو کی بیخ کنی کے لیے خفیہ طور پر کاربند ہیں۔ اس کا تازہ نمونہ ہے اترپردیش سکریٹریٹ کے محکمۂ لسانیات کا شعبۂ اردو زبان، جس کے وزیر اور کوئی نہیں خود وزیر اعلا اکھلیش یادو ہیں۔ آج اس شعبے میں 70 فیصد اردو سے غیر متعلق کام ہورہے ہیں۔ سکریٹریٹ میں شعبۂ اردو کے قیام کا بنیادی مقصد سرکاری گزٹ کو ترجمہ کرکے اردو عوام کو اردو میں مہیا کرانا تھا۔ اس کے علاوہ جو کام اس شعبے کو تفویض تھے ان میں گورنر، وزیر اعلا و دیگر محکموں کو موصول اردو خطوط اور اردو کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کرنا، غیر ملک میں رہائش پذیر ہندستانیوں کے سفارتی مقاصد کے تحت لوکل انتظامیہ سے موصول نکاح ناموں کا ترجمہ اور تصدیق کرنا، ریاستی محکموں اور اہلکاروں کے نام کی پلیٹوں کا اردو ترجمہ، اردو اداروں جیسے اردو اکیڈمی، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی وغیرہ کے انتظامی امور دیکھنا اور اردو کی ترویج کے لیے مختلف اقدامات کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ مگر ان تمام کاموں میں پہلا اور بنیادی کام اردو گزٹ کا ہی ہے جس کے لیے اس شعبے کو قائم کیا گیا تھا۔ تقریباً 20 برسوں تک شعبۂ اردو کے ساتھ سکریٹریٹ میں سوتیلا برتاؤ ہوتا رہا مگر اس کے باوجود شعبۂ اردو گزٹ اور دیگر اردو کے کاموں کو بحسن وخوبی انجام دیتا رہا۔ پچھلے تنخواہ کمیشن کے آنے کے بعد ایس۔ اے۔ ٹی۔ رضوی نے شعبۂ اردو کے سکریٹریٹ کو اصل دھارے میں لانے کے لیے کئی انقلابی قدم اٹھائے، جس کے نتیجے میں سیکشن افسروں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ملازمین کو ترقی کے مواقع فراہم ہوئے، اسی طرح مترجم کا نام تبدیل کرکے جائزہ افسر (اردو) کردیا جس سے ان کی تنخواہ کی ناہمواریاں دور ہوئیں۔ یہی نہیں کمیشن نے انڈر سکریٹری کے عہدے کے لیے ہندی اور اردو ملازمین کی مشترکہ فہرست کی بنیاد پر ترقی کا حکم جاری کیا جو پہلے صرف ہندی والوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ سارے فیصلے مایاوتی حکومت کی کابینہ میں لیے گئے مگر اس وقت کے اردو دشمن افسروں کی منافقت اور مایاوتی سرکار کی بے اعتنائی کے سبب کابینہ کے اس فیصلے تک کو نافذ نہیں ہونے دیا گیا۔ گزشتہ برس جب اکھلیش یادو سرکار آئی تب جاکر کہیں ان فیصلوں پر عمل ہوپایا۔ واضح رہے کہ یہ سارے فیصلے اردو شعبے میں موجود ناہمواریوں کو دور کرنے کی غرض سے تھے مگر ان کے نتیجے میں اسٹاف کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اردو دشمن افسران نے سماج وادی پارٹی حکومت کے خوف سے ان فیصلوں کو تو نافذ کردیا مگر اردو کو نقصان پہنچانے کے لیے ایک نئی قسم کی سازش بڑی خاموشی کے ساتھ تیار کی۔ ۲۳ مئی ۲۰۱۲ء کو محکمۂ لسانیات نے ایک حکم نامہ جاری کرکے نئے سیکشنوں کے قیام کو جہاں قانونی شکل دی وہیں اس حکم نامے میں شعبۂ اردو پر جبراً وہ کام لاد دیے جن کا اردو سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور نہ ہی سرکاری ملازمین کے رولز کے قاعدے میں شعبۂ اردو کو تفویض کیے گئے کاموں میں ان کا کوئی ذکر ہے۔ محکمۂ لسانیات کے سکریٹری اور ان کے ماتحت افسروں کی ملی بھگت سے شعبۂ اردو کو جو نئے کام سونپے گئے ان میں سے کچھ اس طرح ہیں۔ محکمۂ لسانیات ہندی سنستھان وغیرہ میں چل رہے تمام مقدمات کی نگہداشت، محکمہ جاتی مالی منظوریوں کا بل سیل اور متعلقہ معاملات کا نپٹارہ، آر۔ ٹی۔ آئی ایکٹ کے معاملے، وزیر اعلا اور گورنر کے یہاں آنے والے مختلف غیر متعلق محکموں کے معاملے۔ ظاہر ہے کہ ان اضافی کاموں کا سرکاری ملازمت قاعدے میں اردو کے لیے نہ تو کوئی ذکر تھا اور نہ ہی اس کے لیے شعبۂ اردو میں الگ سے کوئی اسٹاف موجود تھا۔ یہ سارے اضافی کام شعبۂ ہندی کو پہلے سے تفویض تھے اور کئی دہائیوں سے ہورہے تھے اور وہاں آج بھی اس کے لیے مکمل اسٹاف موجود ہے۔ ان اضافی کاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعبۂ اردو کے بنیادی کام پس پشت چلے گئے۔ اردو گزٹ کا ترجمہ تقریباً کئی برس پیچھے چلا گیا اور صورت حال یہ ہے کہ ۲۰۰۹ء کے گزٹ کا ترجمہ ۲۰۱۳ء میں ہورہا ہے۔ (اخبار اردو، دہلی)

تک ۲۰۱۳ء کے بورڈ کے لیے فارم بھرے جاچکے ہیں۔

وزیر تعلیم شاہی نے کہا کہ یکم اکتوبر ۲۰۱۱ء کو ہی نوٹیفکیشن جاری کرکے ضلع تعلیم افسروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ ساتویں سبجیکٹ کے لیے طلبہ کا رجسٹریشن کرایا جائے لیکن ضلع تعلیم افسروں نے اس سلسلے میں اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کو خط نہیں لکھا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے محکمۂ تعلیم کے پرنسپل سکریٹری سے کہا ہے کہ ۲۰۱۳ء کے میٹرک امتحان میں آپشنل کے طور پر ساتویں سبجیکٹ کا امتحان لینے کو یقینی بنایا جائے۔ اگلے سال جو میٹرک امتحان ہوگا اس میں ہر حال میں ساتویں سبجیکٹ کا امتحان لیا جائے گا۔ (آزاد ہند، کلکتہ)

اردو ٹیچروں کی بحالی میں بے ضابطگی کے خلاف مقدمہ

پٹنہ (۹ فروری)۔ اسٹیٹ پرائمری ٹرینڈ اسسٹنٹ اردو اساتذہ یونین کے صدر ایس۔ ایم۔ امتیاز نے ایک بیان میں کہا ہے کہ 34540 تربیت یافتہ اساتذہ کی بحالی جو سپریم کورٹ کے حکم پر ہوئی ہے اس میں 12862 اردو اسامیوں کے بجائے صرف 3114 اردو اساتذہ کو ہی بہار سرکار نے بحال کیا ہے بقیہ ایسے امیدوار ہیں جو 50 نمبر کے اردو مضمون اور غلط کالج کے نام پر چھانٹے گئے ہیں یعنی سرکار نے اس کالج کو منظوری نہیں دی ہے مگر عدالت عالیہ نے اسے منظوری دے دی ہے، ان میں بیشتر کالج ایسے ہیں جو این۔ سی۔ ٹی۔ ای قانون نافذ ہونے سے قبل کے ہیں، ان میں بیشتر اردو اساتذہ ایسے ہیں جنھوں نے اسی کالج کی سند لی ہے۔ واضح ہو کہ اسی کالج اور اسی سیشن کے ہندی جنرل اساتذہ کو بحال کرلیا گیا ہے مگر اردو کے اسی سیشن کے تربیت یافتہ امیدواروں کو عدالتی حکم کے باوجود اب تک بحال نہیں کیا گیا ہے۔ ایسے اساتذہ کی تعداد سات ہزار کے قریب ہے۔ قابل غور طلب ہے کہ اس امتیازی سلوک کے خلاف یونین نے ایک مقدمہ ایس۔ ایل۔ پی۔ سول نمبر 26824 دائر کیا ہے جس کے تحت عدالت نے بہار سرکار کو سخت نوٹس جاری کرتے ہوئے ۲۱ فروری تک جواب طلب کیا ہے۔ اس مقدمے کی شنوائی ۲۵ فروری کو ہونے والی ہے۔ عدالت نے اپنے نوٹس میں بہار سرکار سے پانچ سوالوں کا جواب مانگا ہے۔ جواب کے لیے بہار سرکار کے محکمۂ تعلیم کے پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ عدالت نے پوچھا ہے کہ (۱) ہمیں بتایا جائے کہ 34540 اساتذہ میں ایسے اساتذہ کی تعداد کتنی ہے جنھوں نے تقرری نامہ تو لیا مگر اب تک جوائن نہیں کیا؟ (۲) ایسے کتنے اساتذہ ہیں جنھوں نے تقرری نامہ لیا ہی نہیں ہے؟ (۳) جو فرضی کالج این۔ سی۔ ای سے منظور شدہ نہیں ہیں ان میں سے اب تک کتنے کالج کو چھانٹا گیا ہے؟ (۴) غلط طریقے سے بحال کیے گئے اب تک کتنے اساتذہ کو نکالا جاچکا ہے؟ (۵) فرضی کالج کے نام پر چھانٹے گئے اب کتنے امیدوار ہیں، اسی کالج کے اسی سیشن کے تربیت یافتہ امیدواروں کو لے لیا گیا ان کی تعداد بتائی جائے؟ جن لوگوں نے بہار اسٹاف سلیکشن کمیشن کو اپنی بحالی سے متعلق اسناد یا فرضی دی ہے ان کی فائنل لسٹ بن کر تیار ہے، جو عنقریب عدالت میں پیش ہونے والی ہے۔ ایسے اساتذہ پریشان نہ ہوں انھیں پریشان ہونے یا عرضی اور بھاگ دوڑ کرنے یا کسی کے بہکاوے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (آزاد ہند، کلکتہ)

ہندستانی ادبی کلچر کا جلسہ

بنارس (پریس ریلیز)۔ اردو کے مشہور ادیب اور انجمن ترقی اردو جموں وکشمیر کے صدر جناب آنند لہر نے ہندستانی ادبی کلچر بنارس کی ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی مضبوطی کا مطلب وطن پرستی اور سیکولرزم کی مضبوطی ہے۔ ہر وہ ہندستانی جو وطن پرست ہے اور سیکولرزم پر یقین رکھتا ہے وہ اردو مخالف ہو ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ بچوں میں اردو کو مقبول بنانے کے لیے ضروری قدم اٹھانے چاہئیں۔ جہاں گیتوں اور دوہوں کو پڑھانا ضروری ہے وہیں پر غالب، اقبال، پریم چند، بیدی اور کرشن چندر کو بھی پڑھانا ضروری ہے۔ اس موقعے پر آنند لہر کو حیات اللہ انصاری اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ ایک سند، شال اور دس ہزار روپے پر مشتمل تھا۔

ہندستانی ادبی کلچر کے صدر جناب ونے فاتق نے آنند لہر کو دور حاضر کا نمائندہ ادیب قرار دیا اور کہا کہ لہر صاحب کی اردو ادب کے تئیں خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ تقریب میں بنارس اور اس کے باہر سے آئے ہوئے ادبا اور اردو نوازوں نے شمولیت کی۔ جناب جاوید انور نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

سماج وادی پارٹی حکومت سے اردو اساتذہ کی امیدیں وابستہ

شاہجہاں پور، یوپی (۳ مارچ)۔ اترپردیش اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے صوبائی کنوینر محمد صابر خاں نے کہا کہ ہمیں ریاستی سماج وادی پارٹی حکومت سے امید ہے کہ وہ اردو اساتذہ کے مسائل کے تعلق سے سنجیدہ ہے اور ہمیں حق اور انصاف ضرور ملے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو اساتذہ نہ کسی سے پیچھے ہیں اور نہ ہی کمزور۔ ہم اردو اساتذہ کو عزت و وقار دلانے کے لیے پرعزم ہیں۔ محمد صابر خاں نے ان خیالات کا اظہار آج یہاں منعقد استقبالیہ اجلاس کے بعد نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔ میرٹھ سے آئے مسٹر خاں نے بات چیت میں کہا کہ اردو اساتذہ کی اولین تنظیم کا قیام ۱۹۷۳ء میں حسرت ملیح آبادی نے کیا تھا اس کے بعد میرٹھ سے تحریک اٹھی اور ۱۹۹۵ء میں ایسوسی ایشن کی نئے سرے سے تشکیل دی گئی جس میں قدیم تنظیم کے اغراض و مقاصد کے علاوہ نئے مسائل جوڑ کر اردو اساتذہ کو متحد کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ ریاست میں تعینات اردو اساتذہ کے سامنے کئی مسائل درپیش ہیں جن کا انھیں بخوبی علم ہے۔ اردو اساتذہ کے مسائل اور مطالبات کے سلسلے میں ریاستی حکومت کے وزرا سے گفتگو ہوئی ہے، جس سے یہ امید پختہ ہوئی ہے کہ سماج وادی پارٹی کی حکومت اردو اساتذہ کو نہ صرف حق و انصاف دے گی بلکہ اردو زبان کی بقا کے لیے چلائی جارہی تحریکوں کو بھی مضبوطی حاصل ہوگی، جس سے اردو اساتذہ، اردو مترجمین، اردو ادبا و شعرا کو بھی فیض حاصل ہوگا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ہر اسکول کے اردو اساتذہ کو اردو مضمون پڑھانے کے لیے بھی ریاست بھر میں مہم جلد ہی شروع کی جائے گی، کیوں کہ اسکولوں میں اردو اساتذہ کے عہدوں پر تقرر کی اساتذہ سے اردو کے علاوہ دوسرے مضمون پڑھوائے جانے کی شکایات مسلسل موصول ہورہی ہیں، جو اردو اساتذہ اور ہماری ایسوسی ایشن کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے باقاعدہ ایسوسی ایشن اردو اساتذہ کو متحرک کرے گی۔ اس کے لیے ہم اردو شعرا و ادبا سے بھی تعاون لیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست میں مختلف مضامین کی اردو میڈیم کی درسی کتب دستیاب نہیں ہیں، ایسوسی ایشن ان کی اشاعت اور وجود کو بچانے کے لیے گامزن ہے۔ اس کے لیے حکومت سے بات چیت جاری ہے۔ امید ہے کہ اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے جن کا فائدہ اردو جاننے والوں کو ضرور ملے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری ایسوسی ایشن کی یہ بھی کوشش ہوگی کہ ریاست کے ایسے اردو ادبا و شعرا اور قلم کاروں کو خدمات و اعزازات سے نوازا جائے، جو اردو زبان کی خدمت میں دل و جان سے مصروف ہیں۔ (انقلاب، دہلی)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : ہجر بھی وصال بھی
شاعر : ڈاکٹر اندر جیت نرودتی
ضخامت : ۱۱۹ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتہ : اسباق پبلی کیشنز،
سائرہ منزل، ۲۳۰ ربی رو،
دمان درشن، ریلوے پارک، لونا وال
روڈ پونے ۔۴۳۰ مہاراشٹر
تبصرہ نگار : نبیل عارفی

ڈاکٹر اندر جیت نرودتی کا تعلق پنجاب سے ہے جو پنجاب یونیورسٹی سے کیمیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد معاش کی تلاش میں کینیڈا جا پہنچے اور پھر وہیں مستقل مقیم ہو گئے۔ انھوں نے ۱۹۸۳ء میں برنکلم یونیورسٹی یو کے سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی اور پہلے میک یونیورسٹی ہیملٹن کینیڈا اور اب لیک ہیڈ یونیورسٹی کینیڈا میں اپنی ذمہ داری کو بحسن و خوبی نبھا رہے ہیں۔ انھیں اپنے شعبے میں مہارت کی وجہ سے کئی ایوارڈ و اعزاز سے بھی نوازا جا چکا ہے اور وہ بلاشبہ کینیڈا کی مشہور شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں۔

نرودتی جی نے شاعری تو پنجاب ہی میں شروع کر دی تھی لیکن اپنی دوسری ذمہ داریوں کی وجہ سے انھیں اس طرف رجوع کرنے کا کم ہی وقت ملا لیکن جب بھی ان کو موقع ملا انھوں نے اپنے دل کی آواز کو صفحۂ قرطاس پر اتارنے میں دیر نہیں کی اور آج تاخیر ہی سے سہی ان کا شعری مجموعہ 'ہجر بھی وصال بھی' شائع ہو چکا ہے۔ بہت کم ایسے شعری مجموعے شائع ہوتے ہیں جو معنوی سطح پر اپنے نام سے اس طرح ہم آہنگ ہیں جیسے کہ زیرِ تبصرہ مجموعۂ کلام ہے۔ واقعی نام اور کلام میں اتنی مطابقت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کے لیے یہ پہلی بڑی کامیابی ہے کہ اس کے نام کی جھلک اس کے کلام میں بھی بجا طور پر ملے۔

زیرِ تبصرہ مجموعۂ کلام خوبصورت اور دلوں کو چھو لینے والی ایک ایسی شعری کائنات اپنے اندر سمیٹے جلوہ گر ہوا ہے کہ جو پڑھے گا اسے اپنے ہی دل کی آواز معلوم ہوگی اور یہ کسی شاعری کی کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ نظم ہو یا غزل نرودتی جی اپنے دلی جذبات کو قارئین کے سامنے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں گم ہو جاتا ہے۔ ایسا تو کوئی انسان نہیں جس نے محبت نہ کی ہوگی اور ہجر و وصال کے لطف سے واقف نہ ہوگا اور جس نے یہ کڑوے اور میٹھے مزے چکھے ہیں انھیں نرودتی جی کی شاعری بہت اور بہت پسند آئے گی۔

نرودتی جی کی نظموں میں 'خیال' روح کی آواز، مشورہ، امید، رنگ ہجر اور رنگ وصال ایسی نظمیں ہیں جن میں محبت کی ان ہی کیفیات کا ذکر ہے جس سے ہر عاشق گزرتا ہے لیکن الفاظ کہاں سب کا ساتھ دیتے ہیں۔ نرودتی جی ان کیفیات کو بہتر طور پر قلم بند کرنے میں جس درجہ کامیاب ہوئے ہیں یہ ان ہی کا کمال ہے۔ کچھ نظموں کے ایک دو بند ملاحظہ کریں۔

رنگ وصل

سرمئی عارض کی حسیں شام پہ رنگ سہانے
وقت کی ساز پہ ہو رقص کناں جیسے ہوا
اپنی مدہوشی کا عالم کہ یہیں ہو کے رکے
کاش! میں باندھ سکوں آج کا لمحہ

رنگ ہجر

ان جگمگاتی ہوئی لہراتی ہوئی شاخوں میں
تیری باہوں کے لچکنے کی ادا پاتا ہوں
تیری یادوں میں تڑپ اٹھتا ہے میرا ماضی
اور ہر شاخ کے پتے سے لپٹ جاتا ہوں

مشورہ

میری گم گشتہ جوانی کے بیاباں میں
اب تلک تیری صداؤں کی کسک باقی ہے
وہ ہوائیں جو تری زلف سے گزری تھیں
اب بھی ان میں وہی دوست مہک باقی ہے

نرودتی جی نے اپنی نظموں کی طرح ہی غزلوں میں بھی یہی حسن برقرار رکھا ہے اور یہاں بھی وہ غزل کی کیفیت کو اسی تکنیک اور ترتیب سے برتنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ جس طرح انھوں نے نظموں میں کلاسیکی رنگ بکھارا ہے:

ہو اجلی دراز تنہائی
ورد بن کر وہ یاد آتے ہیں

دعوت پہ میری آپ جو آئے ہیں شرمسار
خوشیوں کے اشک بہتے ہیں سیلاب کی طرح

اب ان کے پھول سے چہرے کو دیکھیں یا پھر شب
جب انداز سے نرودتی وہ گلشن میں آتے ہیں

حیا کا رنگ آتا ہے ترے عارض پہ کچھ ایسے
کہ جیسے شام کو بکھری ہو سرخی آسمانوں پر

جانتے ہیں ان کناروں کی سیاست خوب ہم
مل گئے تو موج کے ہو سے میسر پھر کہاں

اس طرح کے بے شمار اشعار آپ کو نہ صرف گدگدائیں گے بلکہ آپ کو اپنا ماضی بھی یاد دلائیں گے جب بھی آپ بھی انہی کیفیات سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ نرودتی جی کی جذباتیت سے مغلوب اس شاعری کو پڑھتے وقت لمحہ بھر کو بھی آپ کو اپنا ماضی یاد آ گیا تو شاعر کامیاب ہے۔

نرودتی جی کچھ الفاظ کو برتنے میں دھوکا بھی کھا گئے ہیں اور کچھ جگہوں پر پروف کی غلطیوں نے بھی مزہ خراب کیا ہے لیکن ان کوتاہیوں کے باوجود دلی جذبات و کیفیات کو اس انداز سے برتنے اور پیش کرنے کا جو سلیقہ نرودتی جی کے یہاں ہے اس کی داد دی جائے گی اور یہ مجموعۂ کلام 'ہجر بھی وصال بھی' کلاسیکی شاعری سے محبت کرنے والوں کو پسند آئے گا۔

OOO

نام کتاب : زخموں کے پھول (افسانے)
افسانہ نگار : ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی
ضخامت : ۱۲۸ صفحات
قیمت : ۱۲۵ روپے
ملنے کا پتہ : فرحت منزل، کالی پلٹن
ٹونک، راجستھان
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی

اردو زبان و ادب کے فروغ و اشاعت میں جن حضرات کا نام سرفہرست ہے ان میں راجستھان کے ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کا نام قابلِ قدر ہے۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کی راجستھان کے حوالے سے 'راجستھان میں اردو تراجم' اور 'اردو میں درس و تدریس' ان کی اہم تحقیقی و تنقیدی کاوشیں ہیں جو صوبہ راجستھان کی بخوبی ترجمانی کرتی ہیں۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے، اس سے قبل ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'سنگِ تر' منظرِ عام پر آکر داد و تحسین قبول کر چکا ہے۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی ادبی دنیا میں سرگرمِ عمل ہیں اور ان کا ادبی سفر جاری و ساری ہے۔

'زخموں کے پھول' میں پیش گفتار مسعود اختر خاں نے لکھا ہے۔ 'اپنی بات' مصنف کی تحریر ہے، اس کے علاوہ اکیس افسانے اور آخر میں چند ادیبوں کے تاثرات بھی شامل کتاب ہیں۔ 'زخموں کے پھول' میں شامل افسانے وقتاً فوقتاً ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں کتابی شکل میں شائع کرکے ادبی ذخیرے میں ایک اہم اضافہ کیا گیا ہے۔ ہر افسانہ قاری کو بغور مطالعہ دیتا ہے۔ تجسس اور تسلسل قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے خواہ وہ 'مقتول کون' ہو یا 'پھر یہ جنگ کب بند ہوگی' دونوں افسانوں میں ہندستان کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ 'شگفتی' میں ہندستانی قدیم روایت میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک کا ذکر موجود ہے۔ 'ڈروپک لینے' میں ہندستان کے تعصبی ماحول میں انسان کی پیچ کشمکش کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'شوبیگم' میں عورت کی سلسلہ وار شخصیت کا ذکر ہے جس میں بیٹی، ماں اور بیوی وغیرہ کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ 'زخموں کے پھول' میں ایک ماں اور اس کے بچوں کے جذبات کو پیش کیا گیا ہے۔ جب کسی ماں کے بچے اس کے سامنے دم توڑ دیں تو کیا حالات پیدا ہوتے ہیں اس کا ذکر اس میں موجود ہے۔ 'نئی سمتوں کا سفر' اور 'فراز' میں بھی ہمارے معاشرے کی حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'ٹھوکر' میں بے میل شادی اور ایک طرفہ عشق کا ذکر ہے اور بیوی اور معشوق کے فرق کو واضح کرکے انجام تک پہنچایا گیا ہے۔ 'جاگرتی' میں مصنف نے اپنی پسند کے موضوع کو کرن کے کردار میں افسانوی رنگ میں پیش کیا اور درس و تدریس کے پیشے کی قدر و قیمت کو سماج کے لیے مفید بتاتے ہوئے خوش حالی کا ذریعہ بھی بتایا ہے۔

'زمین کی بری ہیئوں' کے حوالے سے لکھی گئی بہترین کہانی ہے جس میں بڑوں کی رسائی بھی ہے۔ 'ایجوکیشن' بھی تعلیم بالغاں کے حوالے سے لکھی گئی اچھی اور کارآمد کہانی ہے، جس میں کشش کے حوالے سے تعلیم کی اہمیت کا ذکر ہے۔ 'ہم ہوں گے کامیاب' اور 'سچائی کا تحفہ' ہمارے معاشرے کے لیے نصیحت آموز کہانی ہے بلکہ ایک خوب صورت تحفہ ہے جو کہانی کی شکل میں ہے۔ 'نصیحت' میں مچھر سے پھیلنے والی بیماری ملیریا کا ذکر کہانی کی شکل میں ہے جسے نصیحت آموز ہی کہا جائے گا۔ ایسے ہی رنگ چھوڑتی حنا، اتحاد باہمی، بشکم، نئی زندگی کی تلاش، آب حیات اور مسکراتے لمحوں کا کرب وغیرہ میں بھی ہماری تہذیبی وراثت، اتحاد اور زندگی، اقدار، نئی امنگوں اور نئی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ عزیز اللہ شیرانی صاحب نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماجی و معاشرتی اصلاح کا جو کام کیا ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ شیرانی صاحب کے افسانے میں ہمارے سماج کا عکس صاف نظر آتا ہے، ان کے افسانے حقیقت سے نظر آتے ہیں۔ اسلوب پر بات کریں تو جاذبِ انداز عمدہ ہے، موضوع دل کو چھو لینے والا اور زندہ جاوید ہے جسے پڑھ کر انسان حقیقت کی دنیا سے روبرو ہوتا ہے اور اسے اپنے مشاہدات و تجربات کا عکس ان افسانوں میں صاف نظر آتا ہے۔ کتاب اپنے باطنی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے، امید کہ اسے ادبی حلقے میں خاطر خواہ پسند کیا جائے گا۔

OOO

بقیہ: فلمی دنیا کی ادبی باتیں

صفحہ نمبر ۳ سے آگے

ایک شاندار فلم تھی اور بعض نقادوں نے بہت سراہا تھا۔ پریس میں اس پر بڑے اچھے تبصرے چھپے تھے۔ مالی اعتبار سے ایسی فلمیں کامیاب نہیں ہوتیں لیکن دانش وروں کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ فلم 'روداد' کی کہانی کچھ یوں تھی کہ ایک نیا شادی شدہ جوڑا ہے جو کئی سماجی تضادات کا شکار ہے، نوجوان دلوں کی بہت سی امنگیں ہیں لیکن روزمرہ کی الجھنیں بھی درپیش ہیں۔ اس پس منظر میں نئے بیاہتا جوڑے کی نفسیاتی کشمکش، الفت کے زیر و بم، ہجر و وصال کے لمحات، مضبوط عزائم کے آگے درپیش مصائب، وقت کی بے رخی اور دنیا کی بے مروتی ان سب کو یکجا کرکے کہانی کار نے ایک معیاری اور سلجھا ہوا اسکرپٹ تیار کیا جو تماش بینوں کے دلوں کو چھو گیا۔ بہت برس بیت گئے لیکن اس کہانی کا تاثر آج بھی آرٹ کے دلدادہ تماشائیوں کے اذہان پر باقی ہے۔ جنگ کی تباہ کاریاں اور اس کے مابعد اثرات بڑے اچھے انداز سے پیش کیے گئے تھے۔ اس کے بعد بھی راہی صاحب نے اپنے ہنر کے زیر سایہ کو فلمیں بنائیں، چند کامیاب رہیں، چند ناکام لیکن معیار سب کا بلند رہا۔ محض منافع کمانے کی

غرض سے انھوں نے باکس آفس سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

دادامنی، ساگر فلم لائن سے الگ ہوکر ٹی وی سیریل بنانے لگے تو دیدرا اس کی سرگرمیاں دھیمی پڑ گئیں۔ بہرحال انھوں نے دیگر اداروں کے لیے کئی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے سپردِ قلم کیے جن پر بہتر روشنی وہ خود ہی ڈال سکتے ہیں۔ اردو افسانے کی دنیا میں آج بھی ان کا وہی مقام ہے جو برسوں پہلے تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کا قلم اب رواں دواں ہے۔ اُن کے مداحوں کو آج بھی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔

واڈیا موری ٹون والے عموماً تفریح اور اسٹنٹ فلمیں بنایا کرتے تھے۔ خاموش فلموں کے دور میں انھوں نے 'طوفان میل' بنائی تھی جو بڑی کامیاب رہی تھی۔ ناطق فلموں کا دور آیا تو رنجیت موری ٹون کے مالک سیٹھ چندولال شاہ نے خواہش ظاہر کی کہ اسے آواز کے ساتھ تماش بینوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ دونوں اداروں نے مل کر مشترکہ رنجیت واڈیا موری ٹون کی بنیاد رکھی اور سانجھے سرمائے سے 'طوفان میل' کو بولتی فلم کے روپ میں ریلیز کیا۔ دونوں نے اداروں نے نمائش کے لیے سرکٹ آپس میں تقسیم کرلیے۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ فلم بے حد کامیاب رہی اور اس نے موٹی رقم کمائی۔ اس سے پہلے واڈیا والے 'ہنٹر والی' ۱۹۳۶ء میں بنا چکے تھے۔ وہ بھی ایک اسٹنٹ فلم تھی جو ہٹ ثابت ہوئی تھی۔ اس طرح کی فلموں کے مکالمے اردو جاننے والے منشیوں سے لکھوائے جاتے تھے۔ انھیں اسٹیج ڈرامے پیش کرنے والی کمپنیوں یا پارسی تھیٹریکل کمپنیوں سے اصولاً کرلایا جاتا تھا۔ معمولی سا معاوضہ دے کر ان سے مکالمے لکھوائے جاتے تھے۔ اسی طرح معمولی روپے کے غیر معروف شعرا کو بلا کر ان سے گیت لکھوائے جاتے تھے۔ سکّہ بہرحال اردو زبان کا ہی چلتا تھا۔

واڈیا موری ٹون کے اپنے مستقل تنخواہ دار اداکار اور تکنیک کار تھے جن کے نام نمایاں طور پر فلم کے آغاز میں ٹائٹل میں دکھائے جاتے تھے۔ قارئین حیران ہوں گے کہ اداکاروں کی فہرست میں ایک گھوڑا اور ایک کتا بھی تھے۔ گھوڑے کا نام تھا 'پنجاب کا بیٹا' اور کتے کا نام 'ٹمن بوٹ' تھا۔ دونوں سدھائے ہوئے جانور تھے جو اپنے کرتب دکھاتے تھے اور تماشائی انھیں دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجاتے تھے۔ بعد میں ایک اور آرٹسٹ بھی آگئی جو ایک پرانی موٹر تھی اور اس کا نام 'رولز رائس کی بچی' رکھا گیا۔ فلم کے ٹائٹل میں اب تینوں کے نام آنے لگے۔ فلم کے پوسٹر اور اشتہارات میں بھی ان کے نام چھپنے لگے۔ ان ناموں میں اتنی کشش تھی کہ تماشائی سینما گھروں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

'رولز رائس کی بچی' کی کہانی یہ تھی کہ فلم فائنانسر سیٹھ موہن بھوانی کے پاس ایک پرانی انگلش کار تھی جس پر سوار ہوکر وہ شوٹنگ کے دوران واڈیا اسٹوڈیوز میں آیا کرتا تھا۔ فلم مکمل ہوگئی تو وہ اس گاڑی سے پیچھا چھڑوانا چاہتا تھا لیکن کوئی اس کا گاہک نہیں بننا چاہتا تھا۔ ایک روز جمشید واڈیا نے اپنے دفتر کی کھڑکی سے دیکھا کہ سیٹھ موہن بھوانی ایک کباڑیے سے موٹر کا سودا کررہا تھا۔ کباڑیہ اسّی (80) روپے سے ایک کوڑی زیادہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ بات نہ بن سکی۔ جمشید دفتر سے نکل کر باہر آیا اور بولا "یہ لو سو روپے، اب گاڑی میری ہوگئی"۔ جمشید نے اس گاڑی کو اپنی فلم 'بے بھارت' میں استعمال کیا اور اس کا یہ مکالمہ بے حد پسند کیا گیا۔ "اگر تمھارے پاس رولز رائس موجود ہے تو کیا ہوا، میرے پاس بھی تو رولز رائس کی بچی موجود ہے"۔ اس گاڑی کو پے در پے کئی فلموں میں استعمال کیا گیا۔ ہیرو اور ہیروئن اس میں بیٹھ کر جارہے ہوتے اور ولن ان کا پیچھا کرتا، اس دوران میں یہ گاڑی اپنے کرتب دکھاتی، کبھی دائیں نکل جاتی تو کبھی بائیں، کبھی اونچائی پر پہنچ جاتی تو کبھی گہرائی میں اور ولن منہ تاکتا رہ جاتا۔ غرض کہ یہ گاڑی خوب کرتب دکھاتی۔ کئی لوگ محض اس کے کرتب دیکھنے سینما ہال میں جایا کرتے تھے۔ ایک سو روپے کی گاڑی نے لاکھوں روپے کمپنی کو کما کر دیے۔ ۱۹۶۰ء تک یہ گاڑی واڈیا موری ٹون کی فلموں میں نظر آتی رہی۔ اس کے بعد جب اس طرح کی فلموں کا دور ختم ہوگیا، رومانٹک، سوشل اور مزاحیہ فلمیں بننے لگیں تو 'رولز رائس کی بچی' بھی غائب ہوگئی۔

■❖■

بقیہ: ساگر یونیورسٹی میں اردو تحقیق

صفحہ ۳ سے آگے

(۲) دست گرداں ۱۹۹۲ء
(۳) خطوط نگاری طنز و مزاح اور تنقید، ۲۰۰۱ء

قدوی صاحب کی نگرانی میں آٹھ مقالوں کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہو چکی ہے اور دو پر کام جاری ہیں۔ آٹھ مقالوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) کیفی اعظمی: شخصیت، شاعری اور عہد، وسیم انور، ۲۰۰۲ء
(۲) خواجہ میر درد: شخصیت، شاعری اور تصوف، محمد ایاز احمد، ۲۰۰۲ء
(۳) اختر الایمان: شخصیت اور فن، صغیر احمد، ۲۰۰۲ء
(۴) ترقی پسند اردو غزل آغاز و ارتقا، محمد صادق، ۲۰۰۲ء
(۵) کشمیری لال ذاکر: شخصیت اور کارنامے، وحیدہ بانو، ۲۰۰۵ء
(۶) رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری کا تجزیاتی مطالعہ، محمد ناظر خاں، ۲۰۰۷ء
(۷) اردو السانہ نگاری کا ارتقا (۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء) شبانہ پروین، ۲۰۰۸ء
(۸) ترقی پسند اردو ڈراما: تشکیل و ارتقا ۱۹۶۰ء تک، ارش رضا، ۲۰۰۹ء

۱۹۷۹ء سے ۲۰۰۹ء تک یعنی 30 برسوں میں کل 20 تحقیقی مقالات پیش کیے گئے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی گئیں۔ ڈاکٹر قدا، المصطفیٰ قدوی کا قول ہے کہ "تحقیقی مقالے دو طرح کے ہوتے ہیں، چھپانے کے لائق اور چھپانے کے لائق"۔ لہٰذا زیر بحث 20 مقالوں میں سے تقریباً آدھے مقالے ضرور چھپانے کے لائق ہیں جن میں سے چھ چھپ کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) آغا حشر کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر محمد شفیع، ۱۹۸۸ء
(۲) جگت موہن لال رواں اور ان کی شاعری، ڈاکٹر محمد اشفاق عارف، ۱۹۹۵ء
(۳) ساگر کمشنری کے اہم اردو شعرا اور ان کے کلام کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر محمد ادریس نظامی، ۲۰۰۰ء
(۴) شمالی بندیل کھنڈ کے اہم شعرا کے کلام کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر شہباز احمد، ۲۰۰۲ء
(۵) کیفی اعظمی: شخصیت، شاعری اور عہد، ڈاکٹر وسیم انور، ۲۰۰۵ء
(۶) ترقی پسند اردو غزل: آغاز و ارتقا، ڈاکٹر محمد صادق، ۲۰۱۲ء

پی ایچ ڈی کے لیے کی جانے والی تحقیق میں پہلا مقصد ڈگری حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے محقق اسکالر ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں کہ مواد آسانی سے اور جلد از جلد دستیاب ہو جائے اور جاں سوزی اور محنت و جاں فشانی سے بچا جاسکے، جب کہ تحقیق صبر آزما اور محنت طلب کام ہے۔

پی ایچ ڈی کے تحقیقی کام میں نگراں کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ موضوع کا انتخاب اور خاکہ کی تیاری سے لے کر مقالہ پیش ہونے تک ہر مرحلے پر طالب علم نگراں کی وسعتِ علمی، بلند نظری اور غیر جانبداری سے فیضیاب ہوکر اپنا تحقیقی کام مکمل کرتا ہے۔ ایک اچھا تحقیقی کام اچھی نگرانی کے بغیر بہت مشکل ہے۔ لہٰذا ساگر یونیورسٹی میں اچھے اور کمزور دونوں طرح کے تحقیقی مقالے موجود ہیں۔ ◆◆◆

بقیہ: اردو اور لوک شاہی

صفحہ ۸ سے آگے

ان سے منسوب ہیں جو صوفیانہ کلام کا اہم حصہ ہیں۔ گاندھی جی نے متعدد خطوط اردو زبان میں لکھے، دیپالی گلکتن میں ان کے اردو میں دستخط محفوظ ہیں۔

سردار بھگت سنگھ کا آخری خط جو انھوں نے پھانسی سے قبل اپنے چھوٹے بھائی کلتار سنگھ کے نام تحریر کیا تھا، اردو تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ کلتار سنگھ خود بھی اردو زبان و ادب سے بخوبی واقف تھے۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر، سولن، ہماچل پردیش جو حکومتِ ہند کا ایک بہت بڑا ادارہ ہے، اس ادارے میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد غیر اردو داں طلبہ پر مشتمل ہے۔

امیر خسرو نے ہندوی زبان میں شاعری کی تو شاہ حاتم نے کھری اور دکنی ہندی میں اپنا عوامی کلام پیش کیا۔

نظیر اکبرآبادی نے ہندستانی رنگ اور موضوعات کو نظموں کے ذریعے اپنے کلام میں جگہ دی۔ ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے نظیر کی نظمیں بہت مقبول ہیں۔ بلدیو جی کا میلہ، ہولی، دیوالی، کورا برتن، بنجارہ نامہ اور بسنت وغیرہ بہت مشہور ہیں:

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلہ ہے

تازگی جی کی اور تری تن کی
واہ کیا بات کورے برتن کی

اردو نے اپنے ہر ادبی صنف مثلاً داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، طنز و مزاح، خود نوشت و سوانح، غزل، نظم، مرثیہ، مثنوی، نیز صوفی کلام اور عوامی ادب کے ذریعے عوام و خواص تک رسائی حاصل کی ہے اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی ہے۔

اردو کی تعمیر و ترقی میں چندر بھان برہمن، اسے بھٹنا گر، منشی جواہر پرشاد برق، ماسٹر رام چندر، للو لال، رتن ناتھ سرشار، بنی نرائن، منشی نولکشور، نہال چند لاہوری، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، آنند نرائن ملا، مالک رام، کنور مہندر سنگھ بیدی، پریم پال اشک، بلونت سنگھ اور رتن سنگھ وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ شعرا و ادبا اردو کے ایسے ستون ہیں جنھوں نے اعلا سطح سے لے کر عوامی سطح یعنی لوک شاہی تک اس زبان کو مقبولِ خاص و عام بنادیا۔

اردو زبان کا دامن ہمیشہ سے بہت وسیع رہا ہے، اس زبان نے کبھی خود کو مذہب و ملت اور سرحدوں میں قید نہیں کیا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے اگر نعت کہی تو عقیدت کا اظہار اس طرح کیا:

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

مہندر ناتھ اشک اپنی عقیدت کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں:

اللہ میری فکر کو اتنی رسائی دے
میں سوچتے لگوں تو مدینہ دکھائی دے

فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) کے اہم قلم کار کاظم علی جوان نے شکنتلا ناٹک کا ہندی سے اردو میں بہت سلیس ترجمہ کیا۔ اردو اور برج بھاشا کا ہمیشہ گہرا لسانی تعلق رہا ہے۔

میر، غالب، سودا اور قائم چاند پوری نے ہندی لفظیات کو اپنی شاعری میں خوب برتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ پہلی بار رام بابو سکسینہ نے انگریزی زبان میں تحریر کی تھی بعد ازاں اس کتاب کا اردو ترجمہ کیا گیا۔

اردو کا مزاج ابتدا ہی سے ہندوی، ہندستانی اور لوک شاہی رہا ہے، اس کی بھاشا اور ساہتیہ میں عوام کی آواز بازگشت واضح طور پر سنی جاسکتی ہے۔

اردو کی حفاظت ہمیشہ عوام نے کی ہے اور آج بھی یہ زبان عوام کی بدولت زندہ ہے۔

○○○

اُردو اور لوک شاہی

ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی
ایسوسی ایٹ پروفیسر
یو ٹی آر سی، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ
آف انڈین لینگویجز (حکومت ہند)
سپرون، سولن، ہماچل پردیش

ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا سیکولر ملک تسلیم کیا جاتا ہے۔ آئین ہند (Constitution of India) کے آٹھویں شیڈول میں اردو کو لسانی اعتبار سے وہی درجہ حاصل ہے جو ملک کی دیگر زبانوں کو دیا گیا ہے۔ اس طرح اردو ہندوستان کی باضابطہ آئینی زبان (Constitutional Language) ہے۔ اردو نے اپنے ابتدائی سفر کے دوران کئی نام تبدیل کیے، اس کا پہلا نام 'ہندی' ہے، اس کے بعد 'ہندوی' پھر 'دکھنی' اور کچھ عرصہ 'ریختہ' سے منسلک بھی رہا بعد ازاں مستقل طور پر 'اردو' رواج پا گیا۔

لسانیاتی زبان کے دو روپ مانے گئے ہیں، پہلا روپ 'ہندی' اور دوسرا 'اردو' ہے۔ اردو اور ہندی کی قواعد، لفظیات اور تاریخ میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اردو ایک 'ہند آریائی زبان' (Indo Aryan Language) ہے۔

انسانی سماج کی طرح زبانوں اور لفظوں کے بھی خاندان ہوتے ہیں۔ اگر ہندوستانی زبانوں اور لفظوں کے خاندانوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو پراکرت بھاشاؤں کے حوالے سے برج بھاشا تک پہنچتے اردو کا رشتہ سنسکرت سے جا ملتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو نے ہندوستان کے بطن سے جنم لیا۔ اس کے آغاز و ارتقا اور ترویج و اشاعت میں ہر مذہب و ملت کے ادبا و شعرا نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ بادشاہوں نے اسے درباروں میں جگہ دی، فقیروں، درویشوں اور رشیوں منیوں نے اس زبان کی سرپرستی کی اور اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ اس طرح یہ زبان صرف مسلمانوں کی ہی مادری زبان نہیں بلکہ ہندوستان کے عوام کی زبان قرار پائی۔

ہندی، اردو اور پنجابی ہندوستان کی تین مادری زبانیں ہیں۔ ہندی عربی زبان کا لفظ ہے۔ پنجابی فارسی زبان کا لفظ ہے اور اردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اردو کا رسم الخط ([illegible])، (Perso Arabic) ہے، یہ ایک Pan Language ہے جس کے پڑھنے، لکھنے، بولنے اور سمجھنے والے ہر مذہب و ملت کے افراد ملک کے ہر خطے میں موجود ہیں۔ اس طرح یہ زبان ملک گیر سطح پر اپنا ایک قومی کردار (National Character) رکھتی ہے۔ ملک گیر سطح پر لسانی یکجہتی اور مقبولیت کی وجہ سے یہ زبان قومی یکجہتی (National Integration) کی علامت بن گئی ہے۔

بین الاقوامی سطح پر دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور اداروں میں اردو کے شعبے قائم ہیں، جہاں درس و تدریس اور تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ مختلف ممالک میں اردو کی نئی بستیوں کے قیام سے بھی اس کے فروغ اور مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح بین الاقوامی سطح پر اردو کا ایک Global Character ابھر کر سامنے آتا ہے۔

ہر مذہب و ملت اور ذات پات کا علمی اور مذہبی سرمایہ اس زبان نے اپنے اندر سمو لیا ہے۔ گیتا، مہابھارت، رامائن، بائبل، گرو گرنتھ صاحب اور دیگر مذاہب کی مذہبی کتابوں کے سات سو تراجم اردو زبان میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں، جب کہ بھگوت گیتا کے 65 منظوم تراجم اس زبان میں موجود ہیں۔ ان دنوں اردو روزنامہ 'ہند سماچار' میں 'سر منظرت' کے عنوان سے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ یہ ترجمہ پنڈت رتن پنڈوروی کا تخلیقی شاہکار ہے۔

اردو اپنی شیرینی، لطافت اور لہجے کی مٹھاس کی وجہ سے ہر طبقے میں مقبول خاص و عام ہوتی جا رہی ہے۔ اس زبان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کو پڑھنے اور اس کے لہجے پر مہارت حاصل کر لینے کے بعد دنیا کی کسی بھی زبان کے الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں مشکل پیش نہیں آتی اس لیے یہ زبان ایک عام آدمی کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ سائنٹفک زبان بھی بن گئی ہے۔

اردو کا نہ صرف ہندوستانی زبانوں سے گہرا لسانی رشتہ ہے بلکہ دنیا کی دیگر زبانوں سے بھی اس کا باہمی لسانی تعلق ہے کیوں کہ اردو ہند آریائی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ہند یورپی زبان (Indo European Language) بھی ہے۔ زبانوں کے تعلق سے دنیا کے لسانی منظر نامے پر اردو نے اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔

گارساں دتاسی، اشپرنگر اور جان گلکرسٹ کی اردو خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک لسانی سروے کے مطابق دنیا کی 439 زبانیں اور بولیاں تسلیم کی گئی ہیں، ان میں 221 ہند آریائی اور اس کی ذیلی شاخیں ہیں، ان زبانوں میں اردو بولنے والوں (Urdu Speakers) کی تعداد 900 ملین سے تجاوز کر چکی ہے۔

اردو ایک Multilingual Language زبان ہے۔ کیوں کہ ہندوستانی زبانوں کے علاوہ بھی اردو میں دنیا کی جس قدر زبانوں کے الفاظ موجود ہیں، کسی بھی زبان میں دیگر زبانوں کے اتنے الفاظ نہیں پائے جاتے، اس طرح یہ زبان بین الاقوامی سطح پر لسانی یکجہتی کی علامت بھی ہے۔

اردو کے حکائی ادب (Ora) (شفاہی Literature) لوری، سہرے، چہار بیت، ماہیے، گیت، ٹپے، سوانگ، الوداعیہ، رخصتی، سہاگ، لوک گیت، ملہار، قوالی، نوحے، کنڈلیاں، دوہے، ماہیے، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، بانکیو اور دوہے وغیرہ نے اپنی نغمگی اور لطافت کے ذریعے عوام کے دلوں میں جگہ بنائی ہے۔ یہ ادب تحریری طور پر تو باضابطہ موجود نہیں ہے البتہ ان میں سے بیشتر کی حکائی روایت سینہ بہ سینہ صدیوں سے آج بھی موجود ہے جو اردو کے ثقافتی ادارے کی حیثیت رکھتی ہے اور عوامی سطح پر ادب کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔

غزل اردو شاعری کی آبرو ہے جس نے دنیا کے ہر درد مند دل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ اردو نے 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ بھی دیا اور رام پرشاد بسمل نے غزل کے ذریعے مجاہدین آزادی کے دلوں میں سرفروشی کی تمنا بھی پیدا کی:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

برج نرائن چکبست نے رامائن کے بعض اہم واقعات کا اردو منظوم ترجمہ کیا اور اردو شاعری کو 'سیتا جی کی وفاداری' کے عنوان سے یہ اشعار دے کر زندۂ جاوید بنا دیا:

ہمراہ اپنے بن کو مجھے ساتھ لے چلو
ریکھا تمہارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو

نازک ہے میرا شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا
پھر تو تمہارا ساتھ بھی چھوٹ جائے گا

اقبال ہندوی لفظیات کے ذریعے ہندوستانی رنگ میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

اقبال نے اپنی ایک مشہور نظم 'رام' میں رام چندر جی کو امام ہند کا درجہ دیا ہے:

یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے ہندو Mythology کا اردو میں منظوم ترجمہ منفرد انداز میں پیش کیا ہے:

شو کا وش پان تو سنا ہوگا
میں بھی اے دوست پی گیا آنسو

مولانا حسرت موہانی نے اپنی غزلوں میں شری کرشن کا ذکر بڑے منفرد انداز میں کیا ہے، انہیں کئی بار متھرا اور بندرابن جانے کا بھی موقع ملا، ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرت کرشن
اقلیم عشق آپ کے زیر قدم ہیں آج
حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص

عبدالرحمن بجنوری نے اپنی مشہور نظم 'نٹ راج' میں شو کی صفات بیان کی ہیں۔ گرو نانک نے اگرچہ اپنا پیغام گورمکھی زبان کے علاوہ فارسی شاعری کے ذریعے بھی دیا، لیکن متعدد اردو اشعار (بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں　مطبوعہ: قمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ___ (ادارہ)